

ڈاکٹر عدنان احمد، اسٹنٹ پروفیسر اردو، یونیورسٹی آف نارووال

ڈاکٹر میمونہ ریاض، لیکچرار یونیورسٹی آف ایجوکیشن فیصل آباد کیمپس

Dr. Adnan Ahmed, Assistant Professor Urdu, University of Narowal.
Dr. Memoona Riaz, Lecturer University of Education Faisalabad
Campus.

حلقہ ارباب ذوق اور اردو ناول

HALQAARBAB E ZAOQ & URDU NOVEL

Abstract:

The movement "HalqaArbab e Zaoq" was initiated in a private "Bethak" from 29th April 1939. It famous novelist Naseem Hijazi read out his short story "Talafi" which was the seed of this movement. This movement aimed that literature must be free from all limitations and boundaries. The criticism of Meerajee opens a new era in this regard. Urdu novel gained it's for aggress and development from the platform of HalqaArbab e Zaoq. It bestowed literature with new topics and method of writing with beautiful choice of words. All Novelist belonging to this movement as, Quratulain Haider, Dr. Ahsan Farooqi, Abdullah Hussain, Intezar Hussain and Mustansar Hussain Tararr included new topics in their novels and opened new channels for other novelists.

Key Words: *Halqaarbab e Zaoq, Urdu Nove, Literature, Bethak,*

بیسویں صدی اس اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس صدی میں سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور کئی ادبی اور سماجی تحریکوں کا جنم ہوا۔ اصلاح پسندی کی تحریک کے رد عمل میں رومانوی تحریک وجود میں آئی اور اس کے رد عمل میں ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک نے مارکسی فکر کی بات کی اور ادب برائے زندگی کا موضوع زیر بحث رہا۔ ایسے ادبی منظر نامے میں داخلیت اور ادیب کی آزادی کی طرف توجہ ہوئی تو حلقہ ارباب ذوق کی عملی تحریک سامنے آئی۔ اس عمل اور رد عمل کی کشمکش میں اردو زبان کو خوب پھلنے کا موقع ملا اور اس کو نئے رجحانات نصیب ہوئے کبھی ادب برائے ادب کی بات ہوئی اور کبھی ادب برائے زندگی کی، کبھی انسان کی خارجی دنیا کو اہمیت ملی اور کبھی داخلی احساسات کو اہمیت حاصل ہوئی۔

حلقہ ارباب ذوق کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے تخلیق کاروں کو ہر قسم کی قید سے آزاد کیا ہر موضوع جو ادب کہلایا جاسکتا ہے اسے حلقے میں پیش کیا گیا اور اس نے ادب کو اجتماعی نقطہ نگاہ سے نکال کر انفرادی تخیل کی طرف موڑ دیا۔ اجتماعی سوچ اور نظریہ کے تحت ادب تخلیق کرنے کے بجائے ذاتی تصور اور احساسات کی طرف توجہ دی۔ ہر تخلیق کار اپنی ذات اور داخلیت سے متاثر ہو کر تخلیق کرنے لگا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عارف ثاقب لکھتے ہیں:

”حلقہ ارباب ذوق نے اجتماع میں گم ہو جانے کے بجائے ابن آدم کو اپنی شخصیت کے عرفان

کی طرف متوجہ کیا۔“^(۱)

حلقے نے اپنے رفقاء کی یہ تربیت ضرور کی کہ وہ عصری زندگی کو بھی پیش کرے اور اس کی تخلیق ہمہ گیر اثرات مرتب کرے۔ حلقہ ارباب ذوق نے ترقی پسندوں کی خارجیت کے برعکس زندگی کے داخلی حسن کو اولین ترجیح دی۔ ایسے مضامین کو ترجیح دی جو فرد اور معاشرے کی داخلی دنیاؤں کو اجاگر کرتے ہوں۔ نتیجتاً یہ تحریک نفسیات اور دورں بینی کے مغربی نظریات کی طرف تیزی سے مائل ہونے لگی۔ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک نے مغربی تحریکوں سے متاثر ہو کر ان کے تجربات اردو ادب میں بھی کیے اور نئے رجحانات سے اردو ادب کو متعارف کروایا۔ ان فکری تحریکوں میں جدیدیت اور اس کے تحت تاثیریت، علامتیت، وجودیت اور سرنیلزم وغیرہ کو اردو ادب میں متعارف کروایا۔ اور فنی اعتبار سے ہیئت اور اسلوب کے نئے تجربات کیے گئے۔ ڈاکٹر روش ندیم حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کا پس منظر اور اس تحریک کے ادب پر اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

”تکنیک، ہیئت اور اسلوب کے حوالے سے حلقہ ارباب ذوق کے اجتہاد اور جدیدیت کا تعلق بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ کی مبہول رومانوی تحریک کی ذیلی تحریکوں یعنی ڈاڈا ازم، سرنیلزم، شعور کی رو، علامتیت، تجریدیت وغیرہ سے ہے رومانویوں کے متذکرہ بالا ہیئتیں تجربات کو دو عظیم جنگوں کے خوفناک حالات سے متاثرہ پر آشوب یورپ کی رومانوی داخلیت پسندی نے فروغ دیا جنہیں میراجی اور ان کے احباب نے حلقہ ارباب ذوق میں برتا۔“^(۲)

اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک نے ترقی پسند تحریک کی طرح واضح اردو ناول پر اپنے اثرات نہیں ڈالے مگر اس سے جڑے ناول نگاروں نے حلقے کی وسعت نظری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو ناول کے لیے نئی راہیں کھولی ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق نے خارجی اور داخلی دونوں کو مدغم کر کے ایک نیا اجتہادی رجحان متعارف

کروایا۔ حلقے سے جڑے ناول نگاروں نے خام مال تو خارج سے ہی حاصل کیا مگر داخلی جذبات سے معمور کر کے پیش کیا۔ ناول نگاروں نے صرف فکر معاش میں سرگرداں معاشرے کے پسے طبقے کی محرومی کو نہیں دکھایا بلکہ معاشرے کے افراد کے گہرے جذبات اور احساسات کی ترجمانی فکر و خیال کی باریکیوں کی روشنی میں کی۔ موضوعات کی قید کے بغیر، جنس، محبت، داخلیت، خارجیت، رومانیت، عقلی و فکری مسائل و معاشرت پر بات کی۔ اور زندگی کے مختلف رنگوں کو کہانی کی صورت میں دکھایا۔ شہرت بخاری حلقہ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

”اس جماعت [حلقے] نے اپنا مسلک یہ طے کیا کہ ادب کو اول و آخر ادب ہونا چاہیے۔ نقطہ نظر یا عقیدے سے بحث بے معنی ہے زندگی مختلف تنوع عوامل اور کیفیات سے عبارت ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک اکائی ہے ہر فنکار زندگی اور اس کے متعلقات کے سلسلے میں جو بھی رویہ رکھتا ہے۔ اس کے ذاتی ماحول اور عوامل کا آئینہ دار ہے اور یوں جو ادیب کوئی ادب پارہ تخلیق کرتا ہے۔ وہ اس کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔“ (۳)

حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کے زیر اثر اردو ناول میں تکنیکی و ہیستری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ ادیب مغرب کی جدید تحریکوں سے متاثر تھے لہذا اردو ناول بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اردو ناول میں پاکستانیت، تانہیت و علامتیت اور جدید نفسیات جیسے نئے موضوعات شامل ہوئے۔ نئے علامت رموز، تشبیہات، استعارات، اور نئی تمثالوں کا اردو ناول میں استعمال حلقہ ہی کے توسط سے پیدا ہوا۔ اردو ناول میں کرداروں کی تخلیق، واقعات کی بنت و تنظیم اور ماحول کی پیش کش میں داخلی عناصر کی ہی بدولت تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ڈاکٹر علی محمد خان حلقہ ارباب ذوق کی فنی اور تکنیکی تبدیلیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

”حلقے نے اپنے لیے نئی علامات، نئے تلازمات اور نئے موضوعات کو منتخب کیا، ہیئت اور اسلوب کے بارے میں نئے تجربات کیے اور ادب و شعر کے معیار کو پرکھنے کے لیے اپنے جلسوں میں خالص ادبی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے تعمیر و تنقید کا طریقہ اپنایا۔“ (۴)

حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کے اثرات قبول کرنے والے اہم ناول نگار جن میں قرۃ العین حیدر، احسن فاروقی، انتظار حسین، عبداللہ حسین، بانو قدسیہ، طارق محمود اور مستنصر حسین تارڑ جیسے ناول نگار شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کی سرگرم رکن تھیں۔ اردو ناول کے اعتبار سے انہوں نے اس پلیٹ فارم سے جدید اسلوب اور رجحانات کے حامل ناول تحریر کیے۔ قرۃ العین حیدر جس دور میں ناول نگاری سے وابستہ ہوئیں

اس وقت برصغیر کی تقسیم کا عمل جاری تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے سیاسی کشمکش اور قیام پاکستان کے بعد فسادات، ہجرت، ہندو مسلم عروج پر تھے۔ لہذا قرۃ العین حیدر بھی ان معاملات سے متاثر ہوئیں اور انہوں نے اپنے تین ناولوں میں 'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینہ غم دل' اور 'آگ کا دریا' میں تقسیم ہند اور فسادات کو موضوع بنایا۔ قرۃ العین حیدر نے ان ناولوں میں "ادب برائے ادب" کے رموز و علامت بہت خوبصورتی سے پیش کیے۔ قرۃ العین حیدر کا فطرت کا بے پناہ مطالعہ سے اور فنی اعتبار سے الفاظ کا چناؤ ایک لطیف احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں انگریزی الفاظ اور نئی اینگلو انڈین ترکیب بھی پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی مصنفہ کے انگریزی الفاظ و ترکیب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نیوڈل، ڈی جزیٹ، سوشل ریفرم، لیڈیز کانفرنس، لڑچجر، پریس، سوسائٹی، کلب ممبر شپ، گلیم، آئیڈیل، ٹیسی، اسٹو کریٹ، پیٹری، ان چیف وہ الفاظ ہیں جو بے اختیار مصنفہ کے نوک قلم سے ٹپک پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ عربی قاعدے پر انگریزی الفاظ کا بیوند لگا کر 'کریک الزماں' جیسی دلچسپ اور مضحکہ خیز ترکیب بھی وضع کر لیتی ہیں۔" (۵)

قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول "آخر شب کے ہم سفر" میں کرداروں کے گہرے جذبات و احساسات خارجی عوامل کی روشنی میں پیش کیے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں روشن خیالی اور نئی نسل کے خیالات کو بیان کیا ہے۔ اور اس روشن خیالی میں مادیت پسندی، مصلحت پسندی، خود غرضی اور ریاکاری جیسی کوتاہ خیالی کو بیان کیا ہے۔ جو نئی نسل کی سوچ میں پیوست ہو چکی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" جدید ناول نگاری میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے ناول میں موضوعات اور تکنیک کا ایک جہان آباد نظر آتا ہے۔ تاریخیت، وقت، شعور کی روا اور علامت جیسے نئے اسالیب اور آہنگ ہمیں نظر آتے ہیں۔ "آگ کا دریا" میں دریا کو وقت کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے دو ہزار سال کے دوران پیش آنیوالے حالات کے اتار چڑھاؤ اور تہذیب و اقدا کی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ، لکھنوی تہذیب، وقت، محبت، جنگ جیسے موضوعات سے یہ ناول آراستہ ہے۔ اس میں قرۃ العین حیدر نے تہذیبوں کی کشمکش اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول کے موضوع اور تکنیک کے بارے میں پروفیسر ہارون رشید لکھتے ہیں:

”یہ ناول کوئی عام ناول نہیں۔ اس کا کیوس بھی وسیع ہے اور اس کی تکنیک بھی منفرد ہے۔ اس میں ایک مخصوص فکر اور فلسفہ پیش کیا گیا ہے جس میں تہذیبوں کا ٹکراؤ بھی ہے ایک مخصوص تہذیبی اور سیاسی نظریہ بھی ہے اور تقسیم ہند سے متعلق ایک خاص رویہ بھی ہے۔ اس میں جس فلسفہ کو پیش کیا گیا ہے اس میں مذہب کی اتنی اہمیت نہیں جتنی تہذیب اور کلچر کی ہے۔“^(۶)

قرۃ العین حیدر نے ناول ’آگ کا دریا‘ میں مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعے وقت کے تسلسل میں انسانی حیثیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی نمایاں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں دو ہزار سال تک کے واقعات کو بیان کرنے کے لیے شعور کی روکی تکنیک کو استعمال کیا مگر رئیس قرۃ العین حیدر کے ناول میں شعور کی روکی جدید تکنیک کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

”اس ناول میں انہوں نے وقت کے بہاؤ، آواگون، یا شعور کی رو کے تصورات سے کام لے کر زندگی کی ابھرتی، پھیلتی اور ڈوبتی لہروں کو جیتے، جاگتے کرداروں کی شکل میں جس تخلیقی ہنر سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ اردو میں فن کے ایک اچھوتے اور بے مثل کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناول کی فنی وضع، اور تکنیک میں ایسی ندرت اور نیرنگی ملتی ہے کہ تنقید کی روایتی اصطلاحوں کی قبا اس پر ننگ نظر آتی ہے۔“^(۷)

قرۃ العین حیدر نے ناول کے کردار کی شعور کی رو کی مثال ہری شنکر کی خود کلامی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”کائنات اور اس کی وسعت کہاں سے پیدا ہوئی ہے؟ کہاں جاتی ہے؟ ہم کہاں پیدا ہوئے؟ کس طرح اور کسی وجہ سے زندہ ہیں اور یہاں سے کہاں جائیں گے؟ تم جو برہما سے واقف ہو ذرا بتلاؤ دکھ یا سکھ میں مبتلا کس کے حکم سے ہم یہاں رہ رہے ہیں؟ وقت یا فطرت۔۔۔ یا حادثے۔۔۔ یا عناصر کو سبب سمجھا جائے یا اسے جو پرش کہلاتا ہے جو تمہارے نزدیک پر م آتا ہے۔“^(۸)

ڈاکٹر احسن فاروقی جدید ناول نگاری میں اہم نام ہیں۔ انہوں نے قرۃ العین حیدر کی طرح ناول میں نئی تکنیکوں کا استعمال کیا۔ ان کے ناولوں میں چند ہیئت اور اسلوبیاتی تجربے بھی ملتے ہیں۔ ان تکنیکوں میں شعور کی رو، اشاراتی تکنیک، تاریخی تکنیک وغیرہ جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ ”شام اودھ“ میں احسن فاروقی حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ دیگر ناول نگاروں کی طرح ہیئت اور اسلوب کے نئے تجربات کرتے نظر آتے ہیں۔ احسن فاروقی نے اس ناول میں ’اودھ‘ کی مخصوص تہذیب کے زوال کو پیش کیا ہے۔ ناول کے اہم کردار ”نواب صاحب“ اپنی وضع داری اور رکھ رکھاؤ پر سختی سے کار بند ہیں۔ کہیں وہ انگریز تہذیب سے نفرت کرتے ہیں تو کہیں برصغیر میں پائی جانے والی رسومات کو مغرب میں پسند کیے جانے پر خوش ہوتے ہیں۔ اس کردار کے ذریعے مصنف داخلی کیفیات کو ان کے خارجی معروضیت میں پی اول ”سگم“ میں علامت نگاری کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔ اپنے نظریات کو مختلف علامات کے ذریعے بیان کیا۔ ”سگم“ میں احسن فاروقی نے دو کردار ’مسلم‘ مسلمانوں اور ’ش کرتے ہیں۔ انہوں نے علامتی طور پر پورے اودھ کی تہذیب کے زوال کی کہانی بیان کرتے ہوئے اودھ کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

احسن فاروقی نے حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کے دیگر ادیبوں کی طرح مختلف اسالیب اور تکنیکوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ’اما پاروتی‘ ہندوؤں کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور سگم دونوں کے اتحاد و اتفاق کی علامت ہے۔ اور یہ سگم قیام پاکستان پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ احسن فاروقی نے مغربی ادب کے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر جدید تکنیکوں کو اپنے ناولوں میں استعمال کیا ہے۔ ان تکنیکوں میں سب سے اہم شعور کی رو کی تکنیک ہے۔ انور پاشا لکھتے ہیں:

”سگم میں شعور کی رو کی تکنیک کا ہی کمال ہے۔ کہ مصنف نے نو صد سال کی تاریخ اور واقعات کو اس طرح ناول کے فارم میں محیط کر لیا ہے کہ یہ طویل مدت مسلم کی زندگی کے صرف تین گھنٹوں میں سما جاتی ہے۔ اور اس ناول کا مرکزی کردار ابن مسلم تاریخ کی طویل مسافت طے کرتا ہوا جب ہمارے دور میں آتا ہے تو کہتا ہے ۴۲۰۱ء سے ۶۹۱ء تک زمانہ اس کی زندگی کا محض ایک دن تھا۔“^(۹)

ڈاکٹر احسن فاروقی نے ”سگم“ میں فلپش بیک کی تکنیک کو بھی برتا ہے۔ کراچی پہنچ کر مسلم کا اپنے ماضی کے بارے میں غور کرنا اور اپنی زندگی کا محاسبہ کرنا فلپش بیک کی عمدہ مثال ہے۔ یہ ہیئت و تکنیک حلقہ ارباب ذوق کی ہی دین ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کی تحریک سے وابستہ انتظار حسین نے اردو ناول میں مروجہ روایات کے خلاف بغاوت کی۔ ان کے ناولوں میں کھوئے ہوؤں کی جستجو اور تلاش نظر آتی ہے۔ اور انہوں نے تکنیکی اور فکری اعتبار سے نئے زاویے متعارف کروائے۔ انتظار حسین نے علامت نگاری کے رویے کی شکل میں اسلوب کی جس جہت کو دریافت کیا اس کی حقیقت یہی ہے کہ وجود کے خلفشار اور باطنی سطح پر خلا کے نامراد احساس کے بچوں بچ ان علامات کے حوالے سے تہذیب نفس کے اس مرکزی نظام کی جستجو کرنا ہے۔ انتظار حسین کی دیگر کہانیوں میں بھی علامتوں کے بنیادی اور مرکزی مفہوم کے شعور کے سیاق و سباق میں ان 'تحریف' اسے حاضر کیفیت کا اظہار عطا کرتی ہے۔ انتظار حسین کے ہاں علامتوں کے زوال اور ان کے گم ہو جانے کا شعور 'ہجرت' کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ہجرت خارجی سطح پر تو صرف ایک سر زمین سے دوسری کی طرف نقل مکانی کا عمل ہے لیکن باطنی سطح پر ایک ایسی واردات ہے کہ جس نے انہیں ایک زاویہ نگاہ مہیا کیا ہے۔

انتظار حسین کے ناول "چاند گہن" میں ہجرت ایک واردات کے طور پر سامنے آتی ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہر طرف مسائل کے ڈھیر تھے جسے وہ گہن کی علامت میں استعمال کرتے ہیں۔ اور کچھ ماضی کی ان بستیوں کے لیے بھی جن سے وہ ہجرت کے بعد جدا ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

”امر تر سے کلکتہ تک تو گہن ہی گہن نظر آتا ہے۔ پاکستان کا پتہ نہیں ہے وہ اب میرے لیے دوسرا ملک ہے۔“ (۱۰)

انتظار حسین کا دوسرا ناول ”دن اور داستان“ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کی مصنف کو موضوعاتی آزادی کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں نئی ثقافت کے ظہور پذیر ہونے اور پرانی قدروں کے آہستہ آہستہ مٹ جانے کے موضوع کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ جس میں اس دور کی معاشرت کی عمدہ جھلکیاں ملتی ہیں۔ مثلاً گھروں میں لالٹینیں، پیتل کے چمکتے گلدان، چاندنی، گاؤں تکیہ اور مونڈھے وغیرہ۔

انتظار حسین نے حلقہ ارباب ذوق کی ہیتی اور اسلوبیاتی تبدیلیوں کو بھی اپنے ناول میں برتا ہے۔ ناول ”آگے سمندر ہے“ بذات خود ایک بڑی علامت ہے اور اس کے کردار ”جواد“ کی شکل میں اپنے ماضی اور ہجرت کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ اور زخمی حالت میں اس کردار کی نفسیاتی تحلیل علامتی انداز میں شعور کی رواندرونی خود کلامی اور آزاد تلازمہ خیال کی تکنیکیں استعمال کی گئی ہیں۔ جواد کی شکل میں علامتی انداز کے علاوہ اس کردار کی زبان و بیان کو داستانی اسلوب کے ذریعے ہمارے سامنے بیان کیا ہے۔

”بستی“ ایک نیم علامتی ناول ہے۔ انتظار حسین نے اس ناول میں علامت نگاری سے کام لیا ہے۔ نیم کا درخت، ہندوستان میں رہ جانے والے آبائی مکان، صندوق کی کتیاں، قبر اور ناول کے آخر میں بشارت سے علامت نگاری واضح ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بستی میں مختلف نئی تکنیکوں سے بھی اس ناول کو پیش کیا ہے جس سے یہ ناول جدید ناول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی رقمطراز ہیں:

”اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بڑے پیمانے پر اردو ناول کو اسلوبیاتی تجربے سے گزارنے میں انتظار حسین نے پہل کی ہے۔ ”بستی“ جو بنیادی طور پر ناستیلجیائی ناول ہے۔ اس کو انہوں نے مختلف تکنیکوں اور اسالیب کے تجربوں سے گزارا ہے۔ ان کے یہاں واحد متکلم اور پھر ذکر کے ذریعے کہانی کا بیان ہونا کبھی ڈائری کے اوراق کے ذریعہ کہانی کی معنویت کی تشکیل، تو کبھی جاتکوں، دیو مالائی اور اسطوری حوالوں کی علامتی حیثیتوں کے ساتھ عصری زندگی کے مسائل اور دکھوں کو آشکارہ کرنا ناول کے اسلوب میں تبدیلی کا مظہر بن جاتے ہیں۔“ (۱۱)

انتظار حسین نے ناول ”بستی“ میں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کیں ہیں۔ عوامی سطح پر پھیلی ہوئی اس جھنجھلاہٹ اور عدم تحفظ کی فضا نے پورے معاشرے کو ایک المیہ بنا دیا تھا۔ انہی حالات میں لاہور کے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے افراد کچھ اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں:

”رستے میں ٹینک ہی ٹینک۔ کہتا ہے کہ جب ہم جہاز کی طرف جارہے تھے تو ایسا دھماکہ ہوا جیسے توپ چلی ہو اور پھر تو ایسی دھواں دھواں ہوئی جیسے جنگ شروع ہو گئی ہو اور جب ہمارے جہاز نے ٹیک آف کیا اور ہم نے باہر کی طرف دیکھا تو دور تک دھواں ہی دھواں تھا۔۔۔۔۔“

اچھا۔۔۔۔۔؟

آگے جو کچھ بھی ہو۔۔۔۔۔ سالے بنگالیوں کے تو دھوئیں اڑ گئے۔۔۔۔۔

حرام زادے۔۔۔۔۔ منہ ہی منہ میں غصے میں کوئی بڑبڑایا: اب طبیعت صاف ہو جائے گی۔۔۔۔۔

مسرت، بے زاری، نفرت، غصہ، ہر صورت اظہار سرگوشیوں میں ہو رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس بند فضا سے نکلنا چاہیے۔۔۔۔۔ (۱۲)

انتظار حسین نے حلقہ ارباب ذوق کو بہت کچھ عطا کیا اپنی آخری سانس تک حلقے کے اجلاسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہے اور لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

عبداللہ حسین جدید ناول نگاری میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ناول ’باگھ‘ ایک علامتی ناول ہے۔ اس ناول میں ’باگھ‘ کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے یہ محض ایک خوف ناک آواز ہے جو ناول کا کردار ’شاہ رخ‘ سنتا ہے اور یہ بھی علامت ہے ایک آمر اپنی آمریت کو قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

عبداللہ حسین نے اس ناول میں مرکزی کردار ’اسد‘ کی نفسیاتی الجھنوں کو بھی دکھایا ہے۔ اسد ناول میں اپنے دوبارہ اٹھائے جانے کے تصورات میں گم ہو جاتا ہے اس کا یہ انداز تحلیل نفسی اور شعور کی رو کی تکنیک کا پتہ دیتا ہے۔ اسدیوں کہتا ہے:

”یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ اگر قید میں ڈالنا ہی تھا تو اس علاقے سے باہر کیوں لے جا رہے ہیں؟ اگر دیس سے نکال دینا ہے تو اس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی! یہ عجیب سفر ہے۔“ (۱۳)

عبداللہ حسین نے اداس نسلیں میں جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک کے واقعات پیش کیے ہیں۔ اس پورے عہد کی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور اقتصادی حالات و واقعات اس ناول کا موضوع ہے۔ یہ ناول اپنی تکنیکی و اسلوبیاتی اعتبار سے حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کی عمدہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کی تحریک سے متاثر یورپی ادب کی تکنیکوں سے عبداللہ حسین بخوبی آگاہ تھے انہوں نے شعور کی رو کی تکنیک کو بخوبی پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول کے دوسرے حصے میں کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت انتشار کا شکار تھی۔ اور عبداللہ حسین نے یہاں شعور کی رو کے ذریعے ان کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ عذرا کے ذہنی انتشار کی کیفیت کو عبداللہ حسین یوں بیان کیا ہے:

”اب گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔“ ستائیس برس ”اس نے دفعتاً سوچا چند مہینے میں اٹھائیس برس ہو جائیں گے۔ کیسی عجیب بات ہے یہ سارا وقت سارے عظیم الشان وقت بے کار میں گزر گئے۔ میری ساری تعلیم تربیت زندگی کی اعلیٰ اقدار جن میں یقین کرنا

مجھے سکھایا گیا تھا۔ اعلیٰ دماغ اعلیٰ زندگی ان ساری باتوں کے باوجود آج میں اس جگہ پر آگئی ہوں جہاں ان سب سے الگ ہو کر اپنے متعلق سوچ رہی ہوں۔ شاید میں بوڑھی ہو گئی ہوں آج سے اٹھائیس برس کے بعد میں کیسی لگوں گی۔ مجھے کیا غرض خزاں کا موسم بھی گزر گیا ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اب یہاں پر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اور بہت سی زندگی میرے قریب تیزی کے ساتھ گزر گئی ہے۔” (۱۴)

بانو قدسیہ کا لکھا گیا ناول ”راجہ گدھ“ میں مخصوص نفسیاتی فلسفے کی بات کی گئی ہے۔ اس ناول میں بانو قدسیہ نے رزق حرام کے اثرات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ رزق حلال و حرام نہ صرف آج کی دنیا کا اہم مسئلہ ہے بلکہ یہ ازل سے رہا ہے۔ رزق حرام اپنا اثر ہر حال میں دکھاتا ہے اور دنیا کو تباہی کے کنارے پر لاکھڑا کرتا ہے۔ قیوم کے کردار کو علامت کے طور پر بھی پیش کیا ہے اور آج کی نوجوان نسل کو قیوم کی مانند قرار دیا ہے اور اسی کردار کے ذریعے بانو قدسیہ نے ان نفسیاتی الجھنوں کو بھی اجاگر کیا جو ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی نوجوان نسل میں موجود ہیں۔ قیوم کا نفسیاتی مرض اس حد تک بڑھا ہوا نظر آتا ہے کہ بعض اوقات وہ ایسے رستوں پر جان بوجھ کر چلتا ہے جس پر اسے کامیابی کے آثار بالکل نظر نہیں آتے۔ سیسی اور آفتاب کی قربتیں بڑھتے ہوئے دیکھ کر بھی قیوم سیسی کی طرف رغبت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

”جوں جوں ان دونوں میں فاصلے کم ہونے لگے اتنا ہی بلاوجہ بغیر سوچے سمجھے اور اپنی بہتری کے خلاف میں سیسی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ دل بھی عجیب چیز ہے جب مانتا نہ چاہے تو لاکھ ثبوت پیش کرو، ہزاروں دلائل کو کچھ نہیں مانتا۔“ (۱۵)

اس سب کے باوجود یہ کردار بعض موقعوں پر قابل غور گفتگو بھی کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ فلسفیانہ دلائل پیش کرتا ہے۔ اس کی یہ فلسفیانہ باتیں اور اپنی ذات کا شعور اسے حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کا نمائندہ کردار بناتا ہے۔

”سنو سیسی۔۔ محبت مارتی بھی ہے اور زندہ بھی کرتی ہے پھنکارتی انا کو مارنے کے لیے بھی محبت کا زہر ہے اور قریب المرگ زندگی کو زندہ کرنے کے لیے بھی محبت ہی تریاق ہے۔“ (۱۶)

اس ناول میں انسان کے قول و فعل میں تضاد، حلال و حرام اور خود غرضی سے پیدا ہونے والے مسائل کو اجاگر کیے گئے ہیں۔ مصنفہ نے پاکستان کے دولت مند طبقے کی زندگی کے کھوکھلے پن اور اس طبقے کی نئی اور پرانی دونوں نسلوں کے جذباتی و نفسیاتی مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ بھی نئے موضوعات کو ناول میں پیش کرتے ہیں۔ 'بہاؤ' میں آریائی تہذیب اور قدیم ہندوستان کے دریا گاہر کے کنارے بسنے والی تہذیب کے خدوخال تلاش کیے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے 'بہاؤ' میں صدیوں کی تاریخ کو ایک ناول میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول میں انہوں نے تہذیب و ثقافت کے بننے اور بگڑنے کی داستان لکھی ہے۔

'بہاؤ' میں شعور کی رو کی ایسی تجسیم ہے جس میں صدیوں کے لمحات صدیوں میں تبدیل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول میں "دریا گھاگر" کے کنارے آباد ہزاروں سال پہلے کی ایک بستی کی کہانی بیان کی ہے۔ یہ بستی اپنے روایتی انداز زندگی اور رسوم و رواج کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ لیکن یہ بستی دنیا اور زمانہ کے ساتھ جدید خطوط پر چلنے سے قاصر تھی۔ ناول کے کرداروں کی زبانی مستنصر نے معاشروں کو بننے اور اجڑنے کی کہانیاں بیان کروائی ہیں۔ 'بہاؤ' کا اہم کردار 'سحر و' پاروشنی کے اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ بستیاں بڑی کیسے بنتی ہیں:

"انہیں ہم بڑا بناتے ہیں۔ چھوٹی بستیوں والے ہم نے گھاگر کے کنارے پر جو کچھ بنایا انہوں نے اس کی سن گن پا کر وہاں یہی کچھ بڑ کر کے بنا دیا۔ یہ چوکور مہریں وہ کہاں بناتے تھے، ادھر گھاگر کی بستیوں کے ہیرے ملے، وہاں گئے تو ان کو سکھایا یہ برتن اور کھیتی کرنے کے ڈھنگ ادھر سے گئے۔ بیج یہاں کا تھا اور پھوٹا وہاں جا کر اور رکھ ان کے سروں پر چھایا بنا۔" (۱۷)

مستنصر حسین تارڑ وقت اور حیات کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔ نسلیں بدلتی اور خلط ملط ہوتی رہتی ہیں۔ بستیاں اجڑتی رہتی ہیں۔ لیکن انہی خطوں میں پھر سے زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ صحرا سرسبز و شاداب اور کھیت کھلیاں بنجر زمین میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبیں پھلتی اور پختی رہتی ہیں اور اس طرح زندگی کا دھارا اپنے سفر میں گامزن رہتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول "راکھ" میں علامت نگاری کو استعمال کیا ہے۔ لفظ "راکھ" بھی مستنصر حسین تارڑ نے علامت کے طور پر لیا ہے۔ یہ راکھ جو مصیبت زدہ لوگوں کے چہرے پہ نمایاں ہوتی ہے۔ جن کے

چہرے خوش باش نہیں نظر آتے۔ بلکہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر ان کے مونہوں پر بار بار راکھ مل دی جاتی ہے۔ اس ناول میں چار مرغابیوں کو پاکستان کے چاروں صوبوں کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ناول کا موضوع بنیادی طور پر وقت ہے جو کہ انسان کو مختلف ادوار سے آشنا کرتا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق نے اردو کی تقریباً تمام اصناف ادب کو متاثر کیا ہے۔ ادیب کو آزادی اظہار اور داخلی کیفیات کو ظاہری حالات کے تناظر میں پیش کرنے کی وجہ سے شاعری کے ساتھ ساتھ اردو افسانہ اور ناول میں بھی نت نئے اسلوب اور موضوعات میں تجربات ہوئے۔ اس تحریک ہی کی بدولت جدیدیت کی نئی تحریکوں نے جنم لیا اور اردو ناول نے خوب ترقی کی۔

حوالہ جات

- ۱۔ عارف ثاقب، ڈاکٹر، بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس، لاہور: اظہار سنز پرنٹنگ، ۱۹۹۹ء، ص: ۹۲
- ۲۔ روش ندیم، ڈاکٹر، جدید ادبی تحریکوں کا زوال، راولپنڈی: گندھارا بکس، ۲۰۰۲ء، ص: ۴۹
- ۳۔ شہرت بخاری، بحوالہ اعجاز راہی، ڈاکٹر، حلقہ ارباب ذوق، مشمولہ: پاکستانی ادب، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ص: ۳۷۸
- ۴۔ علی محمد خاں، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان شاعری، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۰۶
- ۵۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، قرآۃ العین کافن، نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۰ء، ص: ۸۸
- ۶۔ ہارون رشید، پروفیسر، اردو کا جدید نثری ادب، کراچی: میڈیا گرافکس، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۶۸، ۲۶۹
- ۷۔ قمر رئیس، تلاش و توازن، دہلی: ادارہ خرام پبلیکیشنز، ۱۹۶۸ء، ص: ۵۲
- ۸۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۸ء، ص: ۱۸، ۱۹
- ۹۔ انور پاشا، ہندوپاک میں اردو ناول، دہلی: پیش رو پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۵۴
- ۱۰۔ انتظار حسین، چاند گہن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص: ۷۷
- ۱۱۔ شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر، معاصر اردو ناول میں اسلوب کے تجربے، مشمولہ اردو ناول۔۔ تفہیم و تنقید، مرتبہ: نعیم مظہر، ڈاکٹر، اسلام آباد: ادارہ فروغ اردو، ۲۰۱۲ء، ص: ۹۱۳، ۰۲۳
- ۱۲۔ انتظار حسین، بستی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص: ۹۷۲
- ۱۳۔ عبد اللہ حسین، باگھ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص: ۰۶۳

۱۴۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص: ۹۸۸

۱۵۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء، ص: ۴۳

۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۲۱

۱۷۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص: ۹۲